شہید کے خون کی طاقت

خالد مسعود خان

میں نے موبائل فون اٹھایا تو دوسری طرف راجہ تھا۔ اس کی آواز میں موں کی شوخی اور زندہ دلی بالکل مفقود تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص پہاڑی لہجے میں دو تین بے ضرر سی گالیاں دینے کے بعد بات کا آغاز کرتا تھا، لیکن اس روز اس کی آواز میں عجیب طرح کی اداسی اور دکھ کی آمیزش تھی۔ خلاف معمول اس نے نہایت عجیب سا سوال کیا۔ پوچھنے لگا کہ کیا شہید کا خون ضائع ہو جاتا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے اس عمر میں اس شرعی مسئلے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ اس نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا کہ کیا کسی شہید کا خون ضائع یا بیکار جا سکتا ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ ایسا ممکن تو نہیں ہے۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا، تو پھر یہاں اسلام آباد میں کیا ہوا ہے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، میں خاموش ہو گیا۔ فون کے دوسری طرف بھی خاموشی چھا گئی۔ راجہ نے چند لمحے توقف کے بعد بولنے کی کوشش کی تو فرطِ غم سے اس سے بولا نہ گیا۔ میں نے کہا، راجہ میں اس وقت اسلام آباد میں ہی ہوں اور تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ فون کی دوسری جانب راجہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور راجہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں سوچ رہا تھا کہ راجہ کے سوال کا جواب تو راجہ کے سوال میں ہی موجود ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ شہید کا خون ضائع ہو سکتا ہے؟ اب بندہ اسے کیا بتائے۔ جس شہادت نے راجہ جیسے روشن خیال، مذہب بیزار اور مولوی دشمن شخص کو رونے پر اور ایک ''مولوی'' کے خون ناحق پر یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہے، بھلا وہ شہادت اور وہ خون ضائع کہاں گیا ہے؟ جو خون اس جیسے شخص کو بھی گھسیٹ کر مذہبی نقطہ نظر سے سوچنے والوں کے دائرے میں لے آئے، بھلا وہ بیکار کیسے جا سکتا ہے؟

راجہ میرا ایم بی اے کا کلاس فیلو ہے۔ دوران تعلیم ہم دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ اس کی ساری دوستی، اٹھنا بیٹھنا، پڑھنا تفریح کرنا ترقی پسندوں کے ساتھ تھا۔ بحیثیت کشمیری وہ جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا کٹر حامی اور خود مختار کشمیر کا پرجوش دعوے دار تھا۔ مذہب اس کی ترجیحات میں اتنا پیچھے تھا کہ تقریباً نہ ہونے کے برابر باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں پاکستان، بلکہ دنیا بھر کی تمام خرابیوں کا چھیانوے فیصد براہ راست ذمہ دار مولویوں کو سمجھتا تھا، بقیہ چار فیصد خرابیوں کا ذمہ دار بھی، وہ بالواسطہ طور پر مولویوں کو ہی سمجھتا تھا۔ ماہ رمضان میں ہوسٹل کا میس بند ہو جاتا تھا، وہ پورا مہینہ ''جماعتیوں'' کو برا بھلا کہتے، چائے پیتے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے گزار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ روزہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ آخر وہ روزے کیوں نہیں رکھتا تو وہ جواباً ہنس کر کہتا کہ وہ روٹی کے بغیر تو بڑی آسانی سے رہ

سکتا ہے، مگر سگریٹ کے بغیر اسے اندیشہ ہے کہ وہ فوت ہو جائے گا۔ میں نے اسے ایک بار اس بارے میں شرط لگانے کا کہا، مگر وہ ہنس کر کہنے لگا، بھلا اب ایسی شرط کا مجھے کیا فائدہ جس میں جیتنے کی صورت میں مجھے مرجانا پڑے اور تم ہارنے کے باوجود زندہ رہو۔ تم سگریٹ نہ پینے کی صورت میں میرے مرنے پر زیادہ سے زیادہ یہ کرو گے کہ پہلی صف میں کھڑے ہو کر میری نماز جنازہ پڑھو گے، میری مغفرت کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگو گے اور ثواب دارین حاصل کرو گے۔ مجھے تمہارے ان اعمال کے لیے مرنے کا کوئی شوق نہیں اور میں تمہارے ثواب کے لیے اپنی زندگی کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں۔ یہ کہہ کر راجہ نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور مجھ سے نہایت رازداری سے پوچھنے لگا۔ اوئے مولوی! تیرے پاس کچھ کھانے کے لیے پڑا ہے۔

میں راجہ کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ سخت ڈپریشن کے عالم میں تھا۔ اس نے مجھ کو دیکھ کر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی۔ اٹھ کر گلے لگایا اور بیٹھ کر پھر سگریٹ سلگائی۔ میں نے دیکھا کہ سگریٹ سلگاتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا دھواں اوپر چھت کی طرف پھینکتے ہوئے، مجھ سے پوچھا کہ یہ اسلام آباد میں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا، یہ آپ لوگوں کا اسلام آباد ہے، ہم جنوبی پنجاب کے پسماندہ لوگ تو یہاں اپنے مسائل کے حل کی امید لے کر آتے ہیں اور ناامید ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم نے اسلام آباد کی پہلی مسجد کو آباد کرنے کے لیے روجھان مزاری سے ایک مولوی بھیجا تھا، 42 سال بعد اس کے بیٹے کی لاش واپس روجھان مزاری میں دفن ہونے کے لیے بھیج دی گئی۔ روجھان مزاری کے دیگر فرزندوں کی تو لاشوں کا پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ چھ جولائی کو لال مسجد میں آخری جمعے کی امامت کرنے والے انعام اللہ کا تو پتہ ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے، یا شہید ہو گیا ہے۔

راجہ بولا ہم اسلام آباد والے کتنے بے حس اور بے رحم ہیں کہ اس آباد شہر کے وسط میں قتل عام ہوتا رہا اور ہم حسب معمول دفتروں میں آ کر حاضری لگاتے رہے، چائے پیتے رہے، گپیں مارتے رہے، غازی برادران کی حماقتوں پر تبصرے کرتے رہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ کرنے والوں کی مذمت کرتے رہے، سات دن تک محاصرے میں بھوکے پیاسے سیکڑوں یتیم، لاوارث بچوں، بچیوں پر مشین گنوں اور مارٹروں سے ہونے والی گولہ باری اور فائرنگ کی آواز سن کر سکون سے سوتے رہے، عالم اسلام کے خواتین کے سب سے بڑے مدرسے کو بارود سے اڑانے کے دھماکے سنتے رہے، سکڑوں طلبا و طالبات کے دھیرے دھیرے موت کے منہ میں جانے کا منظر دیکھتے رہے اور سیکڑوں ایسے طلبا و طالبات کی لاشوں کے صفحۂ ہستی سے ناپید ہونے کا عمل دیکھتے رہے، جن کے سینے حفظ قرآن سے منور تھے۔ میں تو ایک بے عمل، گناہ گار اور ناکام مسلمان ہوں، مگر مجھے گزشتہ تین دن سے نیند نہیں آ رہی، جن لوگوں نے ان سینوں کو چھلنی کر کے وکٹری کا نشان بنایا تھا، وہ کیسے سوئے ہوں گے؟ جنہوں نے ان فرشتہ صورت معصوموں کی لاشیں غائب کی ہوں گی، جامعہ حفصہ میں جلا کر خاکستر کی ہوں گی، بے نام قبروں میں ڈالی ہوں گی، بھلا وہ روز حشر کس قسم کے نامہ اعمال کی امید لے کر زندگی کے بقیہ چند روز گزاریں گے؟

تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ محاصرے کے ان سات دنوں میں محصور خواتین، بچوں، بچیوں اور نوجوانوں پر آنسو گیس کے کتنے شیل، مارٹر گولے، کتنے من بارود، کتنی ہزار گولیاں برسائی گئیں؟ پانی، بجلی، گیس اور کھانا بند کیا گیا۔ کس طرح ان

پر خودکش جیکٹوں کی تقسیم، بارودی سرنگوں، راکٹ لانچروں، گرنیڈوں، دستی بموں، مشین گنوں اور دیگر تباہ کن ہتھیاروں کا الزام لگایا گیا، جو آج اسی طرح غلط ثابت ہوا ہے، جس طرح عراق پر حملے کے لیے امریکہ کے گھڑے ہوئے تمام الزامات غلط ثابت ہوئے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے جلیانوالہ باغ میں گورکھا رجمنٹ نے جنرل ڈاور کے حکم پر سولہ سو پچاس راؤنڈ فائر کیے تھے۔ ہمارے شیر جوانوں نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے محصورین پر کتنے فائر کیے ہیں؟ جلیانوالہ باغ میں ہلاک ہونے والوں کی سرکاری تعداد 279 تھی، جب کہ غیر سرکاری تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی، جب کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ میں جاں بحق ہونے والوں کی سرکاری تعداد ایک سو تین ہے، تاہم غیر سرکاری تعداد جلیانوالہ باغ کے سانحے کی غیر سرکاری تعداد کے برابر ہے۔ مجھے تو شرم آ رہی ہے کہ میں ایسے شہر کا حصہ ہوں، جو اپنے بچوں کے قتل عام پر نہایت بے حسی اور لاتعلقی سے روزمرہ کے کاموں میں مشغول رہا۔ یہ کہتے ہوئے راجہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

شہید ہونے والے بچوں کی اکثریت کشمیر، قبائلی علاقوں، شمالی علاقہ جات اور گلیات سے تعلق رکھتی تھی، ان کے ورثا اسلام آباد کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں اور صرف ایک سوال کرتے ہیں کہ ان کے بچے اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں اور اگر جاں بحق ہو گئے ہیں تو ان کی لاشیں کہاں ہیں؟ آنٹی شمیم کے اغوا پر واویلا کرنے والی این جی اوز اور انسانی حقوق کی پامالی کا شور مچانے والی تنظیموں کی روشن خیال اور ماڈرن خواتین اب کہاں گئی ہیں؟ فحبہ خانے چلانے والی خاتون کے چند گھنٹوں کے اغوا بلکہ تلقین اور تبلیغ پر واویلا کرنے والی غیر ملکی ڈالروں پر چلنے والی انسانی حقوق کی تنظیمیں سینکڑوں طلبا و طالبات کی شہادت پر خاموش ہیں کہ ان کے سینے قرآن کی روشنی سے منور تھے اور ان کے لبوں پر اللہ اور اس کے رسول کا نام تھا۔

راجہ چار چھ ماہ قبل غازی عبدالرشید کا ناقد تھا، مگر وہ غازی عبدالرشید شہید کے لیے بہت سے مولویوں سے زیادہ رنجیدہ ہے۔ راجہ پوچھتا ہے کہ کیا شہید کا خون ضائع ہو جاتا ہے؟ شہید کے خون کی اس سے زیادہ طاقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ راجہ جیسا روشن خیال، مولوی بیزار اور لبرل آدمی بھی آج اسی طرح سوچ رہا ہے، جس طرح کوئی بنیاد پرست مسلمان سوچتا ہے۔ اسے غازی عبدالرشید نے نہیں، شہید عبدالرشید غازی نے متاثر کیا ہے۔ شہید کے خون کی اس سے زیادہ طاقت اور کیا ہو سکتی ہے۔

☆☆

جامعہ حفصہ کی ایک طالبہ نے جیو کے کیپٹل ٹاک میں یہ بتایا کہ جب اس نے چھ جولائی کو کمپلیکس کو چھوڑا، تو وہاں پہلے ہی سو طالبات اور اسی طلبہ کی لاشیں موجود تھیں اور انہوں نے ام حسان کے اصرار پر مدرسہ چھوڑا تھا، یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود نے اپنے جمعہ کے کالم میں تصدیق کی ہے کہ جامعہ حفصہ کی وہ طالبات جن کی عمریں بالترتیب سات اور پندرہ سال تھی، شہید ہوئی ہیں۔

جمعرات کے روز جامعہ حفصہ کا دورہ کرنے والی ایک انگریزی اخبار کی سینئر صحافی نے تحریر کیا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا کمرہ، ایک ہی کہانی سناتا تھا، گھروں کی چاروں دیواروں میں اور چھت پر گولیوں کے گہرے سوراخ ہیں، جس سے کمپاؤنڈ سے ہونے والی سخت مزاحمت کے سرکاری دعوؤں کے بارے میں کئی سوال اٹھتے ہیں۔ (رپورٹ)